Article

# The Emergence of Contemporary Urdu Novel in Balochistan: A Study of Agha Gul's Distinctive Style

# بلوچستان میں معاصر اُردو ناول اور آغا گل کی ناول نگاری

**Abid Hussain***[1]
Assistant Professsor (Urdu), Government Postgraduate College, Quetta
**Nazia Alam***[2]
M.Phil Scholar, International Islamic University, Islamabad

*[1]عابد حسین (عابد میر)
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، کوئٹہ
*[2]نازیہ عالم
ایم فل سکالر، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

Correspondance: khanabadosh81@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

**Received: 10-10-2024**
**Accepted:20-12-2024**
**Online:25-12-2024**

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

**Abstract**: The contemporary Urdu novel in Balochistan began to take shape post-2000, introducing a plethora of novelists, mostly debutants of the new century. This shift enabled them to vividly reflect modern concerns in their works. Agha Gul stands out among these novelists, having initiated his writing career in the 1980s. Although his first novella was published during the same period, his formal novel writing journey commenced in the 21st century, culminating in four novels and one novella to date. Agha Gul's works are distinguished by the pronounced presence of Balochistan's locale, linguistics, and landscapes, collectively forming his unique narrative style. This distinctive approach sets him apart from his contemporary fellow novelists. This article endeavors to highlight Agha Gul's individuality, contextualizing his novels within the broader

framework of contemporary Balochistan's novelistic traditions..

**KEYWORDS:** Contemporary Urdu Novel, Balochistan, Agha Gul, Narrative Style, Locale, Linguistics, Landscapes.

## معاصر کی وضاحت:

لغت میں اس کے معنی 'ہم عہد، اپنے زمانے کا، ہم عصر' کے ملتے ہیں۔(۱)

عصر کی اس الجھن کے سلجھانے کو ہم معاصر کو اکیسویں صدی سے مشروط کر لیتے ہیں۔ ہمارا عہد یوں بھی نائن الیون نامی جس سانحے کی گرد سے اٹا پڑا ہے، وہی اس صدی کا نقطہ آغاز بھی ہے اور اگر اس کے ہم معنی انگریزی لفظ 'کنٹیمپ ریری' کو لے لیں تو معاصر کا معاملہ اور بھی سہل ہو جاتا ہے۔

انگریزی لغت اس کے آسان معنی بتاتی ہے؛

existing or happening now (۲)

گویا لمحہ ء موجود ہی عصر ہے، اور اسی کے گرد تخلیق ہونے والا سبھی کچھ، معاصر۔ اس صورت، اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں صورت پذیر ہونے والا نائن الیون کا دیو، چہرہ بدل بدل کر سہی، اب تک ہمارے گرد ناچ رہا ہے، سو اسی کو ہم معاصر کی علامت بنا لیتے ہیں۔ ہماری نسل کے شعور کی تان یہیں سے اٹھتی ہے۔

اور جب تذکرہ اکیسویں صدی کا ہو تو سمجھیے کہ ایک ایسے دیو سے نبرد آزما ہونا ہے، جس کہ نہ شکل کا اندازہ ہے نہ طاقت کا۔ نہ اس کی نیت صاف ہے نہ کردار۔ نہ جس کا حال بتایا جا سکتا ہے نہ مستقبل۔ نائن الیون، سام راج کے ہاتھ آئی وہ ڈگڈگی تھی کہ جس پہ پوری اکیسویں صدی اب تک ناچ رہی ہے۔ ڈگڈگی کا مالک (سام راج) جب چاہے اسے بٹھا دے، جب چاہے لٹا دے، جب چاہے سلا دے، جب چاہے جگا دے۔ گلوبل ٹینٹ بنی دنیا کا ریموٹ اسی کے کنٹرول میں ہے۔ عالمی شطرنج پہ وہ کب کون سی چال کے لیے کسے بہ طور پیادہ استعمال کرتا ہے، کسی کو کچھ نہیں پتہ۔ اس سے بھی بڑا المیہ یہ کہ اکیسویں صدی کی عالمی شطرنج پہ جب چاہے گھوڑے کو پیادہ، پیادے کو گھوڑا بنایا جا سکتا ہے۔ وزیر کو بادشاہ، بادشاہ کو سپاہی کا روپ دیا جا سکتا ہے۔ ہاتھی، توپ میں بدلا جا سکتا ہے، توپ گھوڑا بن سکتی ...ہے۔ گھوڑا، گدھا بن سکتا ہے۔

> ''مختصر یہ کہ اکیسویں صدی میں کوئی بھی مظہر شفافیت کا حامل نہیں، ہر لفظ
> میں کئی الفاظ کی گونج ہے، ہر تصور میں کئی شبیہیں جلوہ نما اور ہر آواز میں
> بے شمار لہجے شامل ہیں، ایک بے انت ہنگام اور انتشار کی سی صورت ہے
> ،ایک الجھی ہوئی ڈور ہے جس کا کوئی سرا نہیں ، ایک گورکھ دھندا ہے، مایا

> جال ہے، ایک حلقہ دامِ خیال ہے، ہر طرف فریب، دھوکے اور سراب کی سی کیفیت ہے، ایک بے معنی کھیل تماشا ہر سو جاری ہے، ایک دوڑ ہے جس کی نہ کوئی سمت ہے نہ کوئی منزل، ایک سیلِ بلا ہے جس میں سب بے دست و پا ہیں اور کوئی اپنی بے دست و پائی سے آگاہ بھی نہیں، سر دست ایک شور برپا ہے جس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''(۳)

اس عہدِ بے سمتی میں بے بسی کی یہ وہ کیفیت ہے جس سے ہمارے تمام تر شعر و ادب سمیت معاصر ناول کا بھی خمیر اٹھتا ہے۔ اس کے جائزے میں مزید سہولت کے لیے ہم اسے موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر تقسیم کر لیتے ہیں۔ تو آیئے پہلے دیکھتے ہیں کہ ہمارے معاصر ناول کے موضوعات کیا ہیں؟

بلوچستان کا متبادل مزاحمت ہے۔ جہاں بلوچستان کا تذکرہ آئے گا، وہاں مزاحمت کا ذکر ضرور ہو گا۔ مزاحمت، ہر نوع کے جبر کے خلاف، ہر قسم کی سامراجیت کے خلاف۔ جنگ اور مزاحمت کے موضوعات بلوچستان کے ادب کو گھٹی میں پڑے ہوئے ملے ہیں۔ ہمارا سارا فوک، رزمیہ و بزمیہ شاعری اور قصوں سے بھرا پڑا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پروفیسر راز محمد راز کا انگریزی عنوان سے اُردو ناول 'دِی ہولی سِنرز'(۴) انھی ایام میں سامنے آیا 'تو مرد و زن کے ازلی تعلق میں جنسی عمل کی الجھنوں کو فلسفیانہ تناظر میں بیان کرتا یہ اچھوتا ناول، بلوچستان کے عصری مسائل کی دلدل میں گم ہو کر رہ گیا۔ بلوچستان کے مرغوب بیانیے کے باعث یہ ناول وہ توجہ حاصل نہ کر سکا، جس کا یہ حق دار تھا۔ اکیسویں صدی کی اولین دہائی کے نئے ناول نگاروں میں ہاشم ندیم، فارس مغل، عابدہ رحمان، وسیم شاہد شامل ہیں۔ بلوچستان کا دوسرا متبادل، محبت ہے۔ سو' موضوعاتی سطح پر محبت، بلوچستان کے اردو ناول نگاروں کا دوسرا بڑا مرغوب موضوع بھی ہے۔

ہاشم ندیم اس موضوع کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ وہ ان برسوں میں ابھر آنے والے نمایاں ناول نگاروں میں سے ہیں، جنھوں نے یکے بعد دیگرے سات ضخیم ناول دے دیے(۵)۔ گو کہ انھیں پاپولر کمرشل لٹریچر کی ذیل میں رکھا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت وہ بلوچستان ہی نہیں، پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھے اور بکے جانے والے ناول نگاروں میں سر فہرست ہیں۔ سنجیدہ فکشن، چند صاحبِ استطاعت قارئین کی نجی لائبریریوں اور ڈرائنگ روم یا چائے خانوں کی گفت گو تک ہی محدود ہے، عوام میں پذیرائی تو فی الوقت اسی کو حاصل ہے۔

ہاشم ندیم کے ناولوں کے موضوعات بندھے ٹکے ہیں۔ پرانی پاکستانی مصالحہ فلموں کی طرح ایک ہیرو ہیروئین، جن میں سے ایک غریب اور ایک امیر، طبقاتی کشمکش کے درمیان ابھرنے والی نفسیاتی پیچیدگیاں، جن کا حل روحانیت یا مذہب کے تڑکے سے نکالا جاتا ہے۔ یہ وہ سدا بہار نسخہ ہے، جو پاکستان کے پاپولر اُردو ادب میں خوب بکتا ہے۔ نسیم حجازی اور ان کے رفقا نے جس کی بنیاد رکھی اور جسے قدرت اللہ شہاب، مفتی و، ان کے حلقہ ارادت نے ایسا بڑھاوا دیا کہ آج

اشفاق احمد کے افسانے کسی نے پڑھے ہوں یا نہیں، 'بابا صاحبا' کے حوالے (کوٹیشن) سب کو یاد ہیں۔ ہاشم ندیم کے ہاں بھلے بلوچستان نہ ملتا ہو، مگر پاکستان میں ان کے قارئین کی کوئی کمی نہیں۔

فارس مغل (۶) بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ کچھ افسانے بھی لکھے ہیں۔ 'ہم جان' کے عنوان سے ان کا ناول شائع ہوا۔ وہی جذباتی رومانویت اور اس کے ساتھ روحانیت و مذہبیت کا ہلکا سا تڑکا۔ ان کے افسانے موضوعات البتہ سماجی حقیقت نگاری سے مملو ہیں۔ کوئی درجن بھر افسانے ملکی و غیر ملکی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ جب آپ بلوچستان میں رہ کر لکھ رہے ہیں اور سماجی حقیقت نگاری کا شعور بھی رکھتے ہوں تو بلوچستان کے عمومی بیانیے سے نظریں چرائے رہنے تادیر ممکن نہیں رہتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فارس مغل کا دوسرا ناول 'سو سال وفا' جب حال ہی میں شائع ہوا تو اس کا بنیادی موضوع بلوچستان کی حالیہ جنگی صورت حال (انسرجنسی) ہی رہی۔ جس میں محبت کا تڑکا البتہ کچھ یوں شامل کیا گیا کہ کہانی ایک سنجیدہ ناول سے زیادہ کسی ہندی فلم کا اسکرپٹ معلوم ہوتی ہے۔

عابدہ رحمان (۷) کا ناول 'صرف ایک پُل' ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔ یہ محبت کی ایک روایتی کہانی ہے جس میں مذہب کا تڑکا تو شامل ہے، لیکن اختتامیہ کو بامعنی سماجی عمل سے جوڑ کر مصنفہ نے جس عصری ادبی شعور کا ثبوت دیا ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔ عابدہ رحمان کے افسانے بھی وقتاً فوقتاً ماہتاک 'سنگت' کے توسط سے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں موضوعات بالعموم بلوچستان اور بالخصوص خواتین کے سماجی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں۔

شیر دل غیب (۸) کا مختصر ناولٹ 'تیرے فراق میں' کے عنوان سے ۲۰۱۱ء میں سامنے آیا۔ بلوچستان کے عصری سماجی، سیاسی منظر نامے کی عکاسی کرتی مونولاگ طرز میں لکھی گئی یہ نیم سماجی، نیم رومانوی کہانی اپنے طرز کا انوکھا تجربہ تھی۔ یونی ورسٹی کے عشق کے خمیر سے اٹھی کہانی، ظاہر ہے جوان دلوں کو گرماتی ہے۔ اسی بنیادی خیال کے ارد گرد بنی ایک ہی کہانی کے مختلف رنگوں سے شیر دل غیب اب تک پانچ ناولٹ دے چکے ہیں۔ اسلوب، موضوع، طرز اور کہانی ایک ہی ہونے کے باوجود کالج اور یونی ورسٹی کے نوجوان انھیں ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

اس سے مگر فیشن یہ چل پڑا کہ ذرا سا افسانے کو پھیلاؤ اور ناولٹ بنا دو۔ سو، اسی طرز پر خیام ثنا (۹) نے 'ڈھائی دن محبت کے' نامی تجربہ کیا۔ تکنیکی طور پر تو یہ ایک افسانہ ہے، مگر مصنف اسے ناولٹ کہنے پر بہ ضد ہے۔ دہشت کے ماحول میں پروان چڑھتی محبت کی کہانی اس کا موضوع ہے۔ انھوں نے کچھ افسانے بھی لکھے ہیں۔ موضوع، سدا بہار؛ عورت، جنس اور نفسیات۔

حال ہی میں بلوچستان سے ایک نئے فکشن نویس سامنے آئے اور بڑی تیزی سے بلوچستان کے معاصر فکشن میں اپنی جگہ بنائی۔ یہ محمد وسیم شاہد (۱۰) ہیں۔ جن کا اولین ناول 'دیپ کی لو پہ شبنم' ابھی چند برس قبل سامنے آیا۔ یہ لیاری کے ایک نوجوان کی کہانی ہے جو لندن تک جا پہنچا مگر لیاری کی محبت اسے وہیں کھینچ لاتی ہے۔ وسیم شاہد کے ہاں اہم چیز تکنیک ہے۔ وہ کہانی میں قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کا سامان پیدا کیے رکھتے ہیں۔ ان کا یہ ناول اسی قاری اساس کشش کے باعث بلوچستان بھر میں خوب پڑھا بھی گیا، پسند بھی کیا گیا۔ حال ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ جب کہ وسیم

شاہد کا افسانوی مجموعہ بھی اسی برس 'کافر چڑیاں' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اور اب ان کا دوسرا ناول 'ڈھاڈری' رواں برس میں ہی شائع ہوا ہے۔ بلوچستان کی روایتی ادبی فضا کا اثر ہی کہیے کہ وہ اپنے دوسرے ہی ناول میں لیاری سے 'ڈھاڈر' کو موضوع بنانے پہ مائل یا مجبور ہوئے۔

نئے ناول نگاروں میں ایک نوجوان خاتون لکھاری صادقہ خان بھی ہیں۔ جن کا اصل میدان ادب کی بجائے سائنس ہے۔ اس لیے انھوں نے ایک سائنسی موضوع پر ناول نویسی ہے۔ یہ بلوچستان کے فکشن میں اپنی نوعیت کا اولین اور منفرد تجربہ ہے۔ ان کا ناول 'دوام' کے نام سے ۲۰۱۹ سال شائع ہوا۔ موضوع کے ساتھ ساتھ انھوں نے طباعت میں بھی ایک انوکھا تجربہ کیا۔ کتاب خود ہی شائع کی اور خود ہی آن لائن اس کی مارکیٹنگ کی۔ اسی لیے کتاب پر پبلشر سمیت، سنِ اشاعت وغیرہ کچھ درج نہیں۔ ناول کا موضوع قدرتی آفات سے بچاؤ ہے۔ مگر افسوس ناک طور پر لکھاری نے معروف پاکستانی پاپولر رائٹنگ کی طرز پر ایک سائنسی موضوع کو عقیدے سے جوڑ کر کہانی کو بے مقصد اور بے اثر کر دیا ہے۔ نیز کتاب کی طباعت اور پیش کش میں بھی غیر سنجیدگی کے باعث ناول، بلوچستان کے ادبی منظرنامے میں قابلِ استحقاق توجہ بھی حاصل نہیں کر پایا۔

اب رہا اسلوب کا معاملہ، تو اسے ہمارے ہاں فکشن نگاروں اور خصوصاً ناول نگاروں نے بہ طور مجموعی اب تک درخورِ اعتنا جانا ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہ مشکل ہی بلوچستان کے کسی ناول نگار کی تحریر اس کے نام کے بنا پہچانی جا سکے۔ چند احباب نے اپنے تئیں انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش تو کی ہے تو مگر وہ جسے اسلوب کہتے ہیں، اس کا سرا ہاتھ نہیں آ پایا۔ ہاشم ندیم فلیش بیک کی تکنیک استعمال کرتے ہیں، مگر ان کی کہانیاں عموماً سادہ بیانیے کی ہیں۔ وسیم شاہد نے اسی تکنیک کے ذریعے کہانی کو دلچسپ بنانے کی سعی کی ہے۔ مگر اب تک ان کے پہلے ناول میں یہ تکنیک بہ طور اسلوب سامنے نہیں آ پائی۔ خیام ثنا نے اپنے طویل افسانہ (یا ناولٹ) میں ڈائری اور ایس ایم ایس کو کہانی کی بنت کاری میں بہ طور تکنیک برتنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی ہی کاوش حال ہی میں اسلم آزاد نے 'سائی لنٹ لو' (۱۱) نامی ناول میں برتی ہے۔ مگر ان دونوں کتابوں کی زبان و بیان، کہانی کی سطح اور پیش کش میں غیر سنجیدگی اس قدر برتی گئی ہے کہ سنجیدہ ادب میں ان کا تذکرہ ہی غیر سنجیدہ بات کہلائے گی۔ اسی طرح شاہین برانزئی (۱۲) نے بھی ایسے دو ناول لکھے جو زبان و بیان اور پیش کش کے لحاظ سے نہایت غیر سنجیدہ ہیں۔ یہ نہ صرف زبان و بیان کی اغلاط سے پُر ہیں، بل کہ تکنیک کے لحاظ سے بھی ناول کی صنف پر پورے نہیں اترتے۔

ایسے میں اگر بنا نام کے فکشن کی کوئی تحریر اپنے 'بلوچستانی' ہونے کا اعلان کر رہی ہو تو جان لیجیے کہ اس کا مصنف آغا گل ہی ہو گا۔ آغا ہمارے فکشن کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ انھوں نے بلوچستان کے سبھی رنگ اور ذائقے فکشن میں سمو دیے ہیں۔ چار ناولوں اور درجن بھر افسانوی مجموعوں کے ساتھ وہ ہمارے اکلوتے فکشن نویس ہیں، جنھوں نے اس تسلسل کے ساتھ لکھا ہے۔ اور اس تسلسل میں ان کی ادبی کمٹ منٹ نمایاں وصف ہے۔

آغا گل کی ناول نگاری

آغا گل بلوچستان کے چند زود نویس فکشن نگاروں میں سے ہیں۔ انھوں نے اسی کی دہائی کے وسط میں لکھنا شروع کیا۔ اب تک ان کی درجن بھر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں چار ناول اور دیگر افسانوی مجموعے شامل ہیں۔ آغا گل مجموعی طور پر تو بلوچستان کے مقامی منظر نامے میں سماجی، سیاسی موضوعات کو چھیڑتے ہیں، لیکن ان کے اولین تین ناولوں کی کہانیاں خالص رومانوی رہی ہیں۔ جب کہ ان کا ایک ناولٹ ''کافر عشقم'' کے نام سے حال ہی میں ۲۰۲۴ء کے اواخر میں مہر در کوئٹہ سے شائع ہوا ہے اور یہ بھی ایک خالص رومانوی کہانی پر مبنی ہے بل کہ نیم سوانحی طرز کا لگتا ہے۔

آغا گل کا اولین ناول 'دشتِ وفا' قبل ازیں مختصر ناولٹ کی شکل میں 'دشت میں سفر' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کی یہ اولین اشاعت ۱۹۸۶ء میں روبی پبلشرز کوئٹہ سے ہوئی۔ یہ ڈمی سائز یا پاکٹ سائز میں شائع ہوا۔ اس چھوٹی سائز میں اس کے ۱۲۰ صفحات ہیں، قیمت ۳۰ روپے لکھی ہوئی ہے۔ ٹائٹل صادقین کا بنا ہوا ہے۔ جب کہ اس کا انتساب معروف شاعر جمیل الدین عالی کے نام پہ ہے۔ یہ جب پہلی بار شائع ہوا تو اس کی کہانی خالص رومانویت پر مبنی تھی جو ایک المیاتی انجام سے دوچار ہوتی ہے۔ بعد میں جب نوے کے عشرے کے وسط میں اس کی دوسری اشاعت ہوئی تو اسی رومانی کہانی میں ۱۹۷۰ء کے زمانے کی بلوچ مسلح بغاوت کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ جب کہ رومانوی کہانی اسی طرح موجود ہے۔ اب تک اس ناول کے گیارہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مختصراً اس کی کہانی تین مرکزی کرداروں نجیب، رخسانہ اور قاضی پر مشتمل ہے۔ قاضی، رخسانہ پہ فدا ہے۔ رخسانہ بہ ظاہر ایک لاچار و ضرورت مگر چالاک لڑکی دکھائی گئی ہے۔ کہانی کا مرکزی ہیرو نجیب ہے جو ایک متمول گھرانے کا فارغ البال نوجوان ہے۔ کسی کام کے سلسلے میں قاضی، اسے رخسانہ سے ملواتا ہے تو وہ اُس پہ فدا ہو جاتا ہے۔ رخسانہ بھی اس سے پیار سے پیش آتی ہے اور دو طرفہ محبت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ نجیب، قاضی کو کباب کی ہڈی سمجھ کر بیچ میں سے نکال دیتا ہے تو قاضی اس پر منکشف کرتا ہے کہ رخسانہ تین بچوں کی ماں ہے اور اس نے اپنے شوہر کو زہر دے کر قتل کیا تھا۔ یہ انکشاف نجیب پر بجلی بن کر گرتا ہے۔ وہ رخسانہ سے اس کی وضاحت مانگتا ہے تو وہ اسے کم عمری میں ہی ہو جانے والی شادی کا قصہ سناتی ہے جس میں شوہر اس سے جسم فروشی کروانے کی کوشش کرتا ہے، اس لیے وہ تنگ آ کر اسے قتل کر دیتی ہے۔ نجیب یہ سن کر پگھل جاتا ہے اور یوں پھر سے ان کا تعلق جڑ جاتا ہے۔ کچھ عرصے بعد نجیب کا ملازمت کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہوتا ہے۔ واپسی پر اس کا سامنا ایک اور حادثے سے ہوتا ہے۔ رخسانہ ایک سیٹھ کو قتل کر دیتی ہے۔ کیس کی تفتیش کرنے والا پولیس اہلکار اتفاق سے نجیب کا دوست ہوتا ہے۔ جو اسے بتاتا ہے کہ رخسانہ ایک پیشہ ور عورت ہے، اس نے پیسوں کے لیے سیٹھ کا قتل کیا۔ نجیب پر ایک صدمے کا ایک پہاڑ گر پڑتا ہے مگر رخسانہ اسے بتاتی ہے کہ وہ سیٹھ اس کے سابق شوہر کی طرح اسے جسم فروشی پر مائل کر رہا تھا، اس لیے اس نے اسے قتل کر دیا اور اس کا پیسہ بھی لوٹ لیا، چلو اب دونوں بھاگ چلتے ہیں۔ غفار نامی رخسانہ کا ایک عزیز مکران میں اسمگلنگ کے کاروبار سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہ رخسانہ کے کہنے پر ان دونوں کو ساحل کے ذریعے فرار کروانے کو لانچ کا انتظام کر دیتا ہے۔ نجیب ایک بار پھر اس فریب میں آ کر اس کے ساتھ چل پڑتا ہے لیکن وہ رخسانہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بچوں کو ساتھ نہ لے۔ جب وہ ساحل پر

پہنچتے ہیں تو رخسانہ، نجیب سے یہ کہہ کر الگ ہو جاتی ہے کہ تم نے مجھے میرے بچوں سے الگ کر دیا، غفار میرا اپنا ہے، وہ میرا اور میرے بچوں کا خیال رکھے گا۔ تب غفار اسے خود سے الگ کر کے، پیسوں کا بیگ اٹاتا ہے اور لانچ میں بیٹھ کر نکل پڑتا ہے۔ یہ دیکھ کر نجیب گاڑی سے اپنا پستول اٹھاتا ہے اور لانچ پر فائر کر دیتا ہے۔ غفار کی جوابی فائرنگ میں وہ زخمی ہو جاتا ہے مگر اتنے میں لانچ میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ تباہ ہو کر دریابُرد ہو جاتی ہے۔ رخسانہ آگے بڑھ کر نجیب کے زخم پر اپنا دوپٹہ باندھتی ہے۔

سن اَسی کی دہائی میں شائع ہونے والا ناولٹ 'دشت میں سفر' یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ خالص رومانوی طرز پر لکھی گئی کہانی ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں درج سنِ اشاعت کے مطابق پہلی بار یہ ۱۹۸۱ء میں لکھی گئی جب مصنف تیس برس کا ابھرتا ہوا نوجوان تھا (آغا گل، پیدائش: ۱۹۵۱ء)۔ کہانی سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک چوٹ کھائے ہوئے جوان دل کا قصہ ہے۔ اس کا اعتراف بالواسطہ طور پر دبے لفظوں میں مصنف بھی اپنے مختصر پیش لفظ میں بھی کچھ یوں کرتا ہے کہ:

> ''یہ میری کہانی ہے، آپ کی کہانی ہے، ہر اُس انسان کی جس نے کبھی کسی کو چاہا ہو، جو تنہائی کے صحراؤں میں جلتا رہا ہو۔''(۱۳)

بعد ازاں شائع ہونے والے ناول 'دشتِ وفا' میں اسی کہانی میں بلوچ مسلح جدوجہد کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس میں ستر کی بغاوت کا اہم گوریلا کمانڈر خیر جان بلوچ، ناول کے مرکزی کردار نجیب کا دوست دکھایا گیا ہے۔ خیر جان اسے پیغام بھجواتا ہے کہ یہ وطن کے کام آنے کا وقت ہے۔ وہ کچھ زخمی سرمچاروں کو ہسپتال پہنچانے کے لیے اس کی مدد طلب کرتا ہے۔ نجیب ان دنوں محبت میں تازہ چوٹ کھایا ہوا ہوتا ہے، رخسانہ کی بے وفائی کا غم غلط کرنے کے لیے وہ پہاڑوں میں سرمچاروں سے جاملتا ہے۔ آگے چل کر رخسانہ بھی واپس آ جاتی ہے اور ندامت کا اظہار کر کے اس سے معافی طلب کرتی ہے اور پھر دونوں پہاڑوں میں بلوچ گوریلوں کی مدد کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں جا کر حالات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جو نوجوان پہاڑوں میں اپنے حقوق کے لیے سرگرداں ہیں انھیں دراصل مقامی سردار اپنے اقتدار کے لیے مہرے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ بحث مباحثے کے بعد وہ ان مجاہدین کو بھی حقوق کی جنگ ہتھیار کی بجائے قانونی اور آئینی طور پر لڑنے پر قائل کر لیتے ہیں۔ طویل بحثوں کے بعد اس پر قائل ہو جاتے ہیں اور سرنڈر کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ سرداروں کو جب یہ پتہ چلتا ہے تو وہ انھیں راستے سے ہٹانے یعنی قتل کروانے کے لیے اپنے کارندے بھجوا دیتے ہیں۔ فریقین میں زبردست جھڑپ ہوتی ہے۔ سرکاری اہلکاروں کے پہنچنے تک، گوریلوں کے ساتھ لڑتے ہوئے نجیب اور رخسانہ ایک دوسرے کے لیے جان دے دیتے ہیں۔

جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہوا کہ مسلح لڑائی کا حصہ ناول میں بعد ازاں شامل کیا گیا، لیکن اسے نہایت فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ کہانی میں اس طرح سمویا گیا ہے کہ وہ اس کا لازمی حصہ معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ اصل کہانی رومانوی قصے پر مبنی ہے اور رومانس کی عکاسی کرتے ہوئے آغا گل کا قلم جولانیاں دکھانے لگتا ہے۔ گو کہ محبت کے معاملے میں ان کا

رویہ محبوبہ یا عورت کی جانب معاندانہ ہے، لیکن رومانس کی منظر کشی کرتے ہوئے ان کا قلم مناظر میں ڈوب جاتا ہے۔ اس فن میں انھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ مختصر مگر پُر اثر فقروں کے ذریعے وہ کہانی کی تاثیر کو دگنا کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک منظر دیکھیے کہ نجیب جب پہلی بار رخسانہ کو دیکھتا ہے تو اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے، اس کا بیان ملاحظہ ہو:

''اُس نے پہلی بار رخسانہ کے چہرے پر نگارہ ڈالی، نگاہوں سے نگاہیں ملیں... ایک گرج دار دھماکہ ہوا: بگ بینگ... کہکشاؤں میں دراڑیں پڑ گئیں۔ ہزاروں سورج ایک ساتھ آ کھڑے ہوئے... کہکشاؤں کی گردش تھم گئی... کتنے ہی جُگ بیت گئے۔'' (۱۴)...

رومانوی جذبات کی طرح، رومانوی مناظر کی عکاسی میں بھی انہیں سبقت حاصل ہے۔ رومانوی مناظر اور جذبات کو وہ اس طرح گڈ مڈ کر دیتے ہیں کہ دونوں کو الگ کر دینا ناممکن سا ہو جاتا ہے، بلکہ جملے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ایک مثال دیکھئے؛

''اُس کی محبت چپکے سے دل میں یوں اتر سی آتی، جیسے سرد راتوں میں کوئی خوشبو دل کو چھوتی چلی جائے، جیسے شین غر پہ چمپئی شام سمٹ آئے، جیسے چوتیر، بادلوں میں ڈوب جائے۔'' (۱۵)

اپنے پہلے ناولٹ 'دشت میں سفر' سے آغا گل نے جو سفر شروع کیا تھا، وہ رجحان کے لحاظ سے مکمل طور پر رومانوی تھا، جس میں بعد ازاں سماجی حقیقت نگاری کا تڑکا لگایا گیا، اور اپنے افسانوں میں وہ رفتہ رفتہ اسی رجحان کی جانب مراجعت کر گئے، لیکن ان کے ناولوں میں یہی رجحان غالب رہا۔ اس کی مثال ان کے دوسرے ناول سے بھی لی جا سکتی ہے۔

آغا گل کا دوسرا ناول 'بیلہ' کی پہلی اشاعت ۲۰۰۲ء، دوسری ۲۰۰۶ء، تیسری اشاعت ۲۰۰۸ء اور چوتھی اشاعت ۲۰۱۹ء میں سامنے آئی۔ یہ مہر در کوئٹہ سے شائع ہوا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر اس وقت اس کی تیسری اشاعت ہے۔ جو کوئٹہ کے قلات پبلشر سے شائع ہوئی۔ ۱۵۲ صفحات کی کتاب پر ۱۵۰ روپے قیمت درج ہے۔ یہ بھی خالص رومانوی کہانی ہے، جس میں اپنے مزاج سے مجبور مصنف نے کہیں کہیں سماج حقیقت نگاری کا رنگ بھی بھرا ہے۔ لیکن کہانی کا مرکزی خیال، رومانوی ہی رہتا ہے۔

کوچ ڈرائیور رحمان اور بیلہ نامی نوجوان لڑکی ناول کے مرکزی، جب کہ شمروز، ڈاکٹر سرور، کامریڈ، سلمان اور خدو ضمنی کردار ہیں۔ شمروز کوئٹہ، کراچی روٹ کا بہت بڑا ٹرانسپورٹر ہے۔ رحمان کا والد اس کے بچپن میں ہی پہاڑوں پہ بغاوت کے نتیجے میں مارا جاتا ہے۔ شمروز، جوانی میں ہی اسے اپنے پاس لے آتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے رحمان کم عمری میں ہی اس روٹ کا ماہر استاد ڈرائیور بن جاتا ہے۔ ایک روز کراچی سے کوئٹہ اپنے باپ کے ساتھ آتے ہوئے ایک خوبرو نوجوان دوشیزہ اس کا دل موہ لیتی ہے۔ اور وہ اس کے تیر نظر کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا دوست ڈاکٹر سرور اسے بتاتا ہے کہ آنکھوں

کی ایک دوائی کا نام ہے؛ بیلہ ڈونا۔ بیلہ یعنی خوب صورت، ڈونا یعنی عورت۔ یعنی خوب صورت خاتون۔ کیوں کہ پچھلے زمانے میں عورتیں اپنی آنکھوں کی خوب صورتی کے لیے یہ دوائی استعمال کرتی تھیں، اس لیے اس کا نام بیلہ ڈونا پڑ گیا۔ تمہاری آنکھوں میں وہی بیلہ ڈونا نظر آ رہی ہے۔ رحمان کو یہ نام اچھا لگتا ہے۔ لڑکی اس میں سے ڈونا نکال دیتی ہے، یوں اس کا نام بیلہ پڑ جاتا ہے۔ بیلہ، کوئٹہ سے کراچی میڈیکل پڑھنے جاتی ہے۔ پیچھے والدین اور بہن بھائیوں کا بوجھ ہے۔ وہ بھی رحمان کو دل دے بیٹھتی ہے۔ رحمان اس کی محبت میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی۔ رحمان اس کے فیصلے سے مایوس ہو کر کچھ دنوں گاؤں چلا جاتا ہے۔ وہاں کامریڈ سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ جو اسے ایک عورت کی محبت کی بجائے وطن سے، عوام سے محبت کا درس دیتا ہے، اور بالآخر اسے گاؤں میں ایک سکول کے قیام پر قائل کر لیتا ہے۔ رحمان اپنا سارا سرمایہ اسی کام پہ لگا دیتا ہے۔ سکول چل پڑتا ہے۔ بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ کامریڈ وہاں پڑھانا شروع کرتا ہے۔ رحمان واپس اپنی زندگی میں لوٹ آتا ہے۔ سیٹھ شمروز بھی اس کے فیصلے سے خوش ہوتا ہے اور اس کے سکول کے لیے ماہانہ رقم وقف کر دیتا ہے۔

تب سلمان نامی اسمگلر اس سے ٹکراتا ہے۔ جو اسے پیشکش کرتا ہے کہ وہ اس کا ہیروئن کا بریف کیس کوئٹہ سے کراچی لے آیا کرے تو وہ اسے مالا مال کر دے گا، ورنہ اس کی ساری عمر کوچ چلاتے گزر جائے گی۔ رحمان سکول اور بیلہ کے لیے پیسے جمع کرنا چاہتا ہے۔ بیلہ بھی اس کا ساتھ دیتی ہے، کہ کچھ عرصے کے لیے یہ کام کرتے ہیں تاکہ پیسہ جمع ہو جائے۔ البتہ اس دوران سیٹھ شمروز کا نوجوان بیٹا قبائلی دشمن کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ رحمان اس کا انتقام لینے کی قسم کھاتا ہے، اور سلمان سے مدد طلب کرتا ہے۔ سلمان کی مدد سے وہ بیلہ کے ساتھ مل کر دشمن کے بیٹے کو قتل کر دیتا ہے اور اس کے بال نشانی کے بہ طور ایک لفافے میں سیٹھ شمروز کو دے دیتا ہے کہ ابھی مت کھولنا۔ اسی طرح بعد ازاں وہ اصل قاتل کو بھی ڈھونڈ کر مار ڈالتا ہے۔ لیکن اب سلمان اسے بلیک میل کر کے اس سے مفت میں کام لینا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی بھنک سیٹھ شمروز کو پڑتی ہے تو وہ اسے ڈرائیوری سے ہٹا کر دفتر میں بٹھا دیتا ہے۔ رحمان بے زار آ کر نشہ شروع کر دیتا ہے۔ سیٹھ شمروز اسے کمرے میں بند کر اس کے علاج کی کوشش شروع کرتا ہے۔ اُدھر اس کا کلینر خدو، کسی طرح فون کر کے بیلہ کو تمام صورت حال بتا دیتا ہے۔ بیلہ شمروز سے بات کرتی ہے۔ اسے بتاتی ہے کہ اس کے بیٹے کے قاتلوں کو رحمان نے ہی قتل کیا تھا۔ ثبوت اس لفافے میں ہے جو رحمان نے شمروز کو دیا تھا۔ شمروز لفافہ کھول کر دیکھتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے۔ وہ بیلہ کو فوراً اپنی گاڑی میں کوئٹہ پہنچنے کا کہتا ہے، اور دونوں کو ملک سے باہر بھجوانے کا انتظام کرتا ہے۔

اُدھر رحمان کو ہوش آتا ہے تو وہ دفتر کے نمبر سے سلمان کو فون کرتا ہے کہ دفتر آ جاؤ، ایک کروڑ کا سونا سیٹھ کے سیف سے نکالنے کا موقع ہے، ہتھیار بھی لیتے آنا۔ ڈاکٹر کے روپ میں آنا، کوئی نہیں روکے گا۔ سلمان یہ سوچ کر چلا آتا ہے کہ سیٹھ کا سونا لے کر رحمان کو مار دے گا، یا الزام اس پہ ڈال کر نکل آئے گا۔ وہاں پہنچ کر رحمان اس سے پستول طلب کرتا ہے۔ پستول ملتے ہی وہ اس پہ وار کر دیتا ہے۔ سلمان تڑپ تڑپ کر وہیں مر جاتا ہے۔ رحمان اسی کی گاڑی لے کر بیلہ کی طرف کراچی روانہ ہو جاتا ہے۔ خدو، قتل کا الزام اپنے سر لے کر سیٹھ شمروز کو سارا احوال بتا دیتا ہے۔ سیٹھ ہر جگہ

ناکے لگوا دیتا ہے۔ ان ہی ناکوں کو توڑتے ہوئے رحمان کی گاڑی ایک جگہ کھائی میں گر جاتی ہے۔ اگلے دن گاڑی تو مل جاتی ہے، رحمان اس میں سے غائب ہوتا ہے۔ سیٹھ شمروز کی طرف سے تیس لاکھ انعام کے باوجود رحمان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

ناول کے آخری حصے میں، چھے برس بعد کراچی میں واقع ڈاکٹر سرور کے کلینک میں رحمان نہایت دگرگوں حالت میں پہنچتا ہے۔ وہ ڈاکٹر کو بتاتا ہے کہ گاڑی گرنے کے بعد دماغی چوٹ کے باعث اس کی بینائی چلی گئی۔ وہ گرتا پڑتا ایک گاؤں پہنچا۔ کچھ چرواہوں نے کسی کے ذریعے علاج کے لیے کراچی بھیجا۔ یہاں کسی نے اسے نشہ آور دوا پلا کر چوک پہ بٹھا دیا۔ وہ اس سے کئی سال یہ کام لیتے رہے۔ ایک روز ان کی گاڑی نہ آئی تو بھاگ نکلا۔ ڈاکٹر کا نام مشہور تھا، پوچھتے پوچھتے پہنچ گیا۔ وہ فوراً اس سے بیلہ کا حال پوچھتا ہے۔ ڈاکٹر سرور اسے بتاتا ہے کہ اس کا جب کوئی سراغ نہ ملا تو سال بعد اس کی برسی منائی جانے لگی۔ اس کے گاؤں میں سکول کا نام اس کے نام پر ہو گیا۔ سیٹھ نے گاؤں میں اس کے نام پہ ایک مسجد بھی بنا دی۔ ایک ڈسپنسری بھی اس کے نام سے کھلوا دی۔ ایک سڑک کا نام بھی اس کے نام پر رکھوا دیا۔ خدو نے بیلہ کی ایک بہن سے شادی کر لی، جس سے اس کے دو بچے ہوئے۔ اور بیلہ.....بیلہ نے بھی آخر کار شادی کر لی۔ یہ حال سنا کر ڈاکٹر اسے وہیں بیٹھنے کو کہتا ہے جب تک کہ مریضوں سے فارغ ہو کر آ جائے۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد ایک نوجوان اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے باہر گیٹ پر ایک اندھا آدمی منت سماجت کر کے آپ کے نام پر مجھ سے ایک پیغام لکھوا کر آپ کے حوالے کرنے کو کہہ گیا ہے۔ ڈاکٹر کاغذ کھولتا ہے جس پر رحمان کی جانب سے لکھا ہوتا ہے کہ، اس کی موت نے اسے امر بنا دیا ہے، اب اگر وہ اس حال میں اپنے لوگوں میں چلا گیا تو لوگ مایوس ہوں گے، اس لیے وہ کسی کو نہ بتائے کہ رحمان زندہ ہے اور کبھی اُس کی اُس سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔

یہ اس المیے پر کہانی اختتام پذیر ہوتی ہے۔ قطع نظر اس المیاتی اختتام کے، پوری کہانی رومانس سے بھری پڑی ہے۔ رومانوی مناظر، اور رومانوی جذبات کی زبردست عکاسی کی گئی ہے۔ عورت مخالف رویہ گو کہ یہاں بھی نمایاں ہے، لیکن مجموعی طور پر رومانوی فضا حاوی رہتی ہے۔ جیسے بیلہ ڈونا کی تعریف کی گئی، اسی طرح پورا ایک صفحہ محبت کی تعریف میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں رحمان کی جانب سے یہ پوچھنے پر کہ محبت کیا ہے؟، ڈاکٹر سرور محبت کی پوری تاریخ اور تعریف تفصیلاً بیان کرتا ہے۔ اس میں سے صرف چند فقرے دیکھتے ہیں۔

> ''قدیم یونانی کہتے ہیں کہ وینس کا بیٹا کیوپڈ اندھا ہے، وہ محبت کا تیر چلاتا ہے تو دو دلوں سے گزر جاتا ہے، دونوں محبت کرنے لگتے ہیں۔ چوں کہ دیوتا اندھا ہے، دیکھتا ہی نہیں کہ کسے کس سے محبت ہونی چاہیے۔ لہٰذا محبت اندھی ہے۔'' (۱۶)...

ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ چوں کہ بنیادی کہانی ایک ٹرانسپورٹر کی ہے، اس لیے رومانوی جذبات کی عکاسی بھی ٹرانسپورٹ ہی زبان میں کی گئی ہے۔ رومانوی جذبات کے لیے تمام تر تشبیہات اور استعارات اسی سے مستعار لیے گئے ہیں۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں پیش ہیں۔

> ''رحمان نے اچانک دماغ کا کلچ پکڑ لیا، دل کے وہیل فری ہو گئے۔'' (ص، 53)''محبت کا ایکسی لیٹر زیادہ ہو تو مرگی یا پاگل پن قسم کا مرض بن جاتا ہے۔'' (ص، ۵۵)''اس کی زندگی کا کوچ لکپاس کی تنگ گھاٹی میں چڑھائیاں چڑھ رہا تھا۔'' (ص،۵۸)''اگر بیلہ شادی کے لیے راضی ہو جائے تو زندگی کیسی شاندار ہو، جیسے بغیر چھت کے بی ایم ڈبلیو کار... (ص، ۹۴)

تیسرا ناول 'بابو' ۲۰۰۴ء میں سامنے آیا۔ یہ مکتبہ الحمرا لاہور سے شائع ہوا ہے۔ ۱۴۴ صفحات کی کتاب کی قیمت ۱۰۰ روپے درج ہے۔ ناول کی کہانی رومانوی لیکن اس بار طرزِ بیان فکاہیہ ہے۔ اصل میں ناول کا بنیادی خیال کوئٹہ کی اُردو کو کہانی میں سمونا ہے۔ اس لیے کہانی کے دیگر تکنیکی امور کی بجائے مصنف کی تمام تر توجہ اس زبان کو برتنے پر رہی ہے۔ اور اس میں یقیناً وہ کامیاب رہے ہیں۔

کہانی کا مرکزی کردار بابو ایک راجستھانی خاندان سے تعلق رکھتا ہے، جو تقسیم ہند کے نتیجے میں ہندوستان سے ہجرت کر کے کوئٹہ آباد ہو گیا۔ والدین چوں کہ پرانے خیالات کے حامل لوگ ہیں، اس لیے چاہتے ہیں کہ بیٹے کی شادی لازماً کسی راجستھانی خاندان میں ہی ہو۔ جب کہ بابو کوئٹہ میں پیدا ہوا اور یہیں پلا بڑھا ہے۔ اس لیے اس کے لچھن کوئٹہ کے بانکوں جیسے ہیں۔ وہ کسی دوشیزہ کے عشق میں گرفتار ہونا چاہتا ہے۔ شازیہ نامی لڑکی کے پہلے ناکام عشق کے بعد وہ نسیم نامی لڑکی کے زرودار عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ استاد اشرف، صدیق، انور، زمیا کہانی کے دیگر ضمنی کردار ہیں۔ ان میں سے انور اور صدیق، بابو کے لنگوٹیے ہیں۔ والدین کسی صورت نسیم سے شادی پر راضی نہیں ہوتے۔ مایوس ہو کر بابو رشتے داروں کے پاس حیدرآباد چلا جاتا ہے۔ دوست اس کی تلاش میں وہاں آتے ہیں، تو اسے ایک پُل کے نیچے خودکشی کی کوشش کرتے دیکھتے ہیں۔ وہ اسے سمجھا بجھا کر واپس لے آتے ہیں۔ بالآخر انور کا باپ، محلے کے دیگر لوگ مل کر بابو کے باپ کو نسیم کے رشتے کے لیے راضی کر ہی لیتے ہیں۔ یوں دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ شادی کے بعد تمام دوست اپنی اپنی زندگیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ انور، پڑھائی کر کے سی ایس پی افسر بن جاتا ہے۔ صدیق، حیدرآباد جا کر کسی سیاسی پارٹی کا عہدے دار بن جاتا ہے۔ یہاں بابو ایک دفتر میں کلرک ہی رہ جاتا ہے۔ جب کی اس کی بیوی نسیم سکول میں ہیڈ مسٹریس بن جاتی ہے۔ اس لیے وہ اب اسے کہیں بھی اپنے ساتھ لے جانا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ بابو اس کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر شہر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہاں انور کی ڈیوٹی سندھ کے کسی علاقے میں لگتی ہے۔ صدیق اسے اپنے ایک جلسے میں بلاتا ہے۔ انور، جلسے کے بعد صدیق سے فرمائش کرتا ہے کہ اسی تھڑے والے ہوٹل پہ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں، جہاں کبھی بابو کو

ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے۔ وہاں جاتے ہیں تو اسی پُل کے نیچے پھر کوئی آدمی خودکشی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اسے بچانے کے لیے قریب جاتے ہیں تو وہ بابو ہی ہوتا ہے۔

کہانی مکمل طور پر فکاہیہ ہے، البتہ چوں کہ رومان کے گرد قصہ بُنا گیا ہے، اس لیے بیچ بیچ میں رومانس کا تڑکا لگایا گیا ہے۔ لیکن طنز و مزاح اس قدر حاوی ہے کہ رومانوی فقروں میں بھی طنز یا مزاح گھس جاتا ہے۔ ایک فقرہ دیکھیں۔

''میں عشق میں ایم اے، وفا میں پی ایچ ڈی اور محبت کی یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں۔''(۱۷)

مجموعی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ آغا گل نے فکشن کا آغاز رومانوی تحریروں سے ہی کیا۔ البتہ بعد ازاں وہ سماجی حقیقت نگاری کے ترقی پسند رجحان کی جانب مائل ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے افسانوں کی نسبت ناولوں میں رومانوی رجحان ہی غالب نظر آتا ہے۔ ماسوائے آخری، تازہ ناول 'فسانہ جنات' کے، (اشاعت: ۲۰۱۶ء)، جو کہ ایپک اسٹائل میں لکھا گیا ہے۔ جس میں تاریخ کو فکشن میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بلوچستان میں انگریز عہد میں بچھائی گئی ریلوے لائن کی تاریخ پہ مبنی ہے۔ اس کے علاوہ 'دشتِ وفا' اور 'بیلہ' خالص رومانوی رجحان کے، جب کہ 'بابو' نیم رومانوی رجحان کا ناول کہا جا سکتا ہے۔

بطور مجموعی آغا کی تحریریں موضوع اور اسلوب ہر دو لحاظ سے غنی ہیں۔ ان کی تحریروں کا لوکیل بلوچستان کی سرحدوں تک رہتا ہے، مگر فکری طور پر آفاقیت کا پرچارک ہے۔ اور یہی لوکیل در حقیقت ان کے منفرد اسلوب کی تشکیل بھی کرتا ہے۔ آغا گل صرف لوکیل اور موضوع ہی نہیں تشبیہات اور استعارے تک بلوچستان کی مٹی سے لیتے ہیں۔ اسی لیے میں نے کہا کہ جو فکشن پارہ اپنے بلوچستانی ہونے کا اعلان کرے، اس کا مصنف آغا گل کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

الغرض، بلوچستان میں اردو ناول نگاری کا سفر اپنی مجموعی کچھوے کی رفتار سے جاری ہے۔ رفتار کی سستی اور مقدار کی قلت البتہ اب تک اس کے مجموعی اسلوب کی تشکیل نہیں کر پائی۔ بلوچستان میں مگر مجموعی آبادی اور 'ادبی آبادی' کے تناظر میں دیکھیں تو معاملہ ایسا مایوس کن بھی نہیں۔ پاپولر فکشن سے قطع نظر اس کے موضوعات اپنے عصر سے جڑے ہوئے ہیں۔ بلوچستان کی سطح پر اسے اپنا قاری بھی میسر ہے۔ اکیسویں صدی میں شائع ہونے والے اکثر ناول دوسری اشاعتوں سے سرفراز ہو چکے ہیں۔

بلوچستان کا معاصر ناول اپنی جون میں نامکمل تو ہو سکتا ہے، 'نااہل' نہیں۔ دراصل بلوچستان کے اردو فکشن کو پاکستان کے مجموعی اردو فکشن کے تناظر میں دیکھنا زیادتی ہو گی۔ دونوں کا محض تاریخی تناظر ہی نہیں، لوکیل، موضوع اور اسلوب بھی یکسر جدا ہیں۔ دریائے راوی والے، دریائے ناڑی دیکھ لیں تو شاید دریا کے معنی ہی بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن جب آپ پانی کی بوند بوند کو ترستے، قحط سالی کے مارے بلوچستان سے آشنا ہوں گے، تبھی جان پائیں گے کہ خشک آبے کا مارا دریائے ناڑی ہی کیوں کر ہمارا سب سے بڑا دریا ہے۔

# حواشی و حوالہ جات

۱۔ دیکھئے ''نور اللغات'' از مولوی نور الحسن نیرّ،، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع سوم، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۸۴

2.http://dictionary.cambridge.org/dictionary/english/contemporary

۳۔ دانیال طریر، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور غالب، کوئٹہ: مہر در، ۲۰۱۳ء ص ۱۲۵

۴۔ راز محمد راز، دی ہولی سنرز، کوئٹہ: غزنوی پبلشرز، ۲۰۰۴ء

۵۔ ہاشم ندیم، ۲۰۰۵ء سے ۲۰۱۵ء کے درمیان ۷ ضخیم ناولوں کے مختلف ایڈیشن، مختلف اداروں سے شائع ہوئے۔ اہم ناولوں میں ''خدا اور محبت''، بچپن کا دسمبر''، عبداللہ 1''، ''عبداللہ 2''، پری زاد''، ''مقدس'' و دیگر شامل ہیں۔ ایک افسانوی مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۶۔ فارس مغل کا پہلا ناول ''ہم جان'' زیب پبلشرز لاہور سے ۲۰۱۲ء میں اور دوسرا ناول ''سو سال وفا'' ہم جان پبلشرز، کوئٹہ کے زیر اہتمام ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔

۷۔ عابدہ رحمان، صرف ایک پل، کوئٹہ: مہر در ۲۰۱۶ء

۸۔ شیر دل غیب، تیرے فراق میں، کوئٹہ، مہر در، ''کوٹھی نمبر 52''، ۲۰۱۴ء، تربت: سعیدہ پبلی کیشنز، ''آخری خط'' (۲۱۰۶ء)، کوئٹہ: مہر در، ''43''، کوئٹہ: مہر در

۹۔ خیام ثنا، ڈھائی دن محبت کے، کوئٹہ: ساچ پبلشرز، ۲۰۱۴ء

۱۰۔ محمد وسیم شاہد، ''دیپ کی لو پہ شبنم''، (۲۰۱۷ء)، ''ڈھاڈری'' (۲۰۱۹ء)، کراچی: علم و ادب پبلشرز، ''اک چ اندیرو حرم کا''، (۲۰۲۳ء)، لاہور: ورلڈ ویو پبلشرز

۱۱۔ اسلم آزاد، سائی لنٹ لو، کراچی: عاصم پبلشرز، سنِ اشاعت ندارد (۲۱۰۶ء)

۱۲۔ شاہین بارانزئی کا پہلا ناول ''سی پیک'' ۲۰۱۹ء میں اور دوسرا ''پارلیمنٹ'' کے نام سے ۲۰۲۰ء میں گوا ڑخ پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔

۱۳۔ آغا گل، دشت میں سفر، کوئٹہ: روبی پبلشرز، ۱۹۸۶ء، ص ۶

۱۴۔ آغا گل، دشتِ وفا، کوئٹہ: مہر در، (نویں اشاعت)، ۲۰۱۶ء، ص ۳۰، ۳۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۴، ۳۳

۱۶۔ آغا گل، بیلہ، کوئٹہ: قلات پبلشرز، (تیسری اشاعت)، ۲۰۰۷ء، ص ۷۷

۱۷۔ آغا گل، بابو، لاہور: مکتبہ الحمرا، ۲۰۰۴ء، ص ۵۳